اِس ماہ کی خاص کہانی



دوشے

روز وہ بستر پر پڑا دن چڑھے تک کروٹیں بدلتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ باہر صحن میں تیز چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہڑبڑا کر اس نے رضائی ایک طرف پھینکی اور جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر انگڑائی لے کر کسل مندی دُور کرنے لگا لیکن اس مہینے کے ہر روز کی طرح، آج بھی اس کے لیے دن کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

گھر میں بالکل سناٹا تھا۔ اس نے دروازے سے جھانک کر باہر دیکھا۔ اس کی بیوی دالان میں ایک طرف سر جھکائے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ تینوں بچوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ صبح ہی صبح وہ باہر میدان میں کھیلنے نکل گئے تھے۔ اس نے سوچا اس وقت بیوی سے بات کرنا مناسب

اُردو کے مشہور ادیب خُدا کی بستی
جیسے معرکہ آرا ناول
کے خالق
شوکت صدیقی کی زہریلی تحریر

جو زندہ ہیں وہ اس کی شدّتیں محسوس کریں گے

ہمارے پڑوس کی ایک کہانی

نہیں اس لیے یہی بہتر ہے کہ پہلے وہ بچّوں کو بلا کر گھر میں لے آئے اور جب ذرا چہل پہل ہو جائے تو پھر کوئی بات چیت کی جائے۔ کچھ یہی سوچ کر وہ کمرے سے نکل کر دالان میں آ گیا۔ بیوی نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا لمحے بھر کو دونوں کی نظریں ملیں، مگر کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ چُپ چاپ گھر سے باہر چلا گیا۔

دروازے ہی پر اسے ڈپٹی کا ڈرائیور مل گیا۔ اس وقت وہ گہرے نیلے رنگ کی اونی وردی پہنے ہوئے تھا۔ سر پر ڈرائیوروں والی ٹوپی تھی۔ ڈرائیور گوشت کا گورا چِٹا نوجوان تھا۔ لمبا تڑنگا جسم، چہرے پر تازہ خون کی دمک، وردی پہن کر وہ بڑا شاندار نظر آ رہا تھا اور اس کے سامنے وہ خود کسی کیڑے کی طرح حقیر معلوم ہو رہا تھا۔ ڈرائیور نے اسے دیکھتے ہی اپنی بھاری آواز میں کہا: "ماسٹر جی السلام علیکم۔"

وہ حقیر کیڑے سے یک بارگی، باعزت آدمی بن گیا۔ اس نے لہجے میں ضرورت سے زیادہ شفقت پیدا کرتے ہوئے جواب دیا: "وعلیکم السلام۔ کہو میاں گھر میں سب خیریت ہے؟ بال بچّے اچھّی طرح ہیں نا؟"

وہ کہنے لگا: "سب خدا کا شکر ہے ماسٹر جی۔"

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اس وقت اسے ڈیوٹی پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ صاحب کے دفتر جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ اب وہ ناشتے سے فارغ ہو کر ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے ہوں گے۔

ڈرائیور تیز تیز قدم اٹھاتا ڈپٹی صاحب کے بنگلے کی جانب چل دیا۔ وہ دروازے پر کھڑا میدان کے اس سرے تک دیکھتا رہا جہاں بہت سے بچّے ہجوم کی صورت میں چیخ چیخ کر شور مچا رہے تھے اور ان سے ذرا فاصلے پر انگریزوں کی سی وضع قطع کا ایک آدمی کیمرہ لیے ان کے فوٹو لے رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سارا ہنگامہ کا ہے کا ہے۔ وہ آگے بڑھ کر اس طرف غور سے دیکھنے لگا۔ اسی اثنا میں اسے سامنے سے بجلی گھر کا مستری آتا ہوا نظر آیا۔ وہ وہیں سے آ رہا تھا۔ جب مستری قریب آیا تو اس

نے پوچھا: "یہ بچّے اتنا شور کیوں مچا رہے ہیں؟"

وہ کہنے لگا: "میں بھی یہی دیکھنے گیا تھا۔ وہ جو کیمرہ لیے صاحب کھڑا ہے، وہ بچّوں کے سامنے چاکلیٹ، ٹافیاں اور پیسے پھینک رہا ہے اور جب بچّے انھیں اٹھانے کے لیے جھپٹتے ہیں تو وہ جلدی سے ان کا فوٹو کھینچ لیتا ہے۔"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولا: "فوٹو کھینچ لیتا ہے؟ کیوں؟"

مستری نے اس کی حیرت کا اہمیت نہ دیتے ہوئے جواب دیا۔ "پتہ نہیں۔ نہ جانے کیسا آدمی ہے، جب بچّے اس کے قریب آ جاتے ہیں تو انھیں ڈانٹ کر دور کر دیتا ہے اور جب وہ چلّاتے ہیں تو کھیسیں نکال کر خود بھی ہنسنے لگتا ہے۔ میں نے بچّوں کے برابر کھڑے ہو کر سوچا تھا کہ لاؤ ایک فوٹو میں بھی کھنچوا ڈالوں تو سالے نے انگریزی میں ایک موٹی سی گالی دے کر مجھ کو الگ ہٹا دیا۔"

اس نے جھٹ سے کہا: "اور تم نے گالی سُن لی؟"

وہ بولا: "ہاں جی اور کیا کرتا؟"

ماسٹر جی کو جو تھوڑی بہت ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول لیتے تھے، مستری کی اس بے غیرتی پر بڑا تاؤ آیا۔ ان کا جی چاہا کہ وہ ابھی جا کر اسے اس بُری طرح جھاڑیں کہ اسے بھی معلوم ہو جائے کہ اس محلّے میں مستری کی طرح سب بے غیرت ہی نہیں بستے ہیں بلکہ کچھ شریف لوگ بھی بستے ہیں۔ مستری جیسے یہ بات تاڑ گیا تھا۔ اس نے فوراً موضوع بدل دیا۔ کہنے لگا۔ "اچھا ہوا اس وقت آپ سے ملاقات ہو گئی۔ میں کئی روز سے آپ کی تلاش میں تھا۔"

اس نے گھبرا کر کہا: "کیوں، خیریت تو ہے؟"

مستری آہستہ سے بولا: "بات یہ ہے کہ ——" کہتے کہتے وہ رُک گیا جیسے وہ اپنی بات کہنے میں جھجک محسوس کر رہا تھا۔

اس نے اُس کی جھجک محسوس کرتے ہوئے فوراً سہارا دیا: "ہاں۔ ہاں کہو کیا بات ہے؟"

مستری کہنے لگا: "بات یہ ہے کہ میری بیوی پچھلے کچھ دنوں سے بڑی بیمار ہے۔ اس کا تو آپ کو بھی پتہ ہوگا۔"

اس نے فوراً لقمہ دیا: "ہاں، سنا تو ہے کہ تمھارے گھر میں سے آج کل علیل ہیں۔"

مستری بتانے لگا: "اس لیے کھانے پکانے کی بڑی تکلیف ہے۔ آج کل گھر سے کچھ کھائے پیے بغیر ہی ڈیوٹی پر چلا جاتا ہوں۔ بچّے الگ ستاتے ہیں۔ گھر والی کا حال یہ ہے کہ وہ تو اٹھنے بیٹھنے سے بھی لاچار ہوتی جا رہی ہے۔ بڑی مشکل سے دن کٹ رہے ہیں۔"

انھوں نے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے کہا: "بھئی تو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ اور لگ کر علاج کراؤ۔ اس طرح کیسے کام چلے گا؟"

مستری کہنے لگا: "علاج تو اس کا ہو رہا ہے مگر اس وقت سوال تو کھانے پینے کا ہے اور گھر کی دیکھ بھال کا ہے۔" اس نے لمحے بھر توقف کیا اور حرفِ مطلب پر آ گیا: "میں نے سوچا آپ کا ہاتھ بھی آج کل ذرا تنگ ہے۔ آپ کی گھر والی، دن میں اکثر کچھ نہ کچھ مانگنے آ جاتی ہیں۔ تو اس سے ہم دونوں کو بڑی شرم معلوم ہوتی ہے۔ کوئی ہرج نہ ہو تو وہ میرے گھر کی ذرا دیکھ بھال کر دیا کریں۔ کھانا تیار کر دیا کریں۔ کوئی زیادہ کام نہیں ہے۔ اپنا ہی گھر سمجھ کر کام کر دیا کریں۔ دونوں وقت کے کھانے کے علاوہ میں آپ کو ۲۰ روپے مہینہ دے دیا کروں گا اور اس کے علاوہ ۔۔۔ !"

مگر اس نے بات پوری کرنے سے پہلے ہی ٹوک دیا: "اور اس کے علاوہ پھٹے پرانے کپڑے دے دیا کروں گا۔ یہی مطلب ہے نا تمھارا؟" غصے اور جذبات کی شدت سے اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی: "مستری، خدا نے ہم پر وقت ڈالا ہے تو تم بھی جو چاہو کہہ لو۔ اللہ اللہ! اب یہ وقت آ گیا ہے کہ ماسٹر فرزند علی کی بیوی تمھارے گھر کے برتن مانجھے، ماماگیری کرے۔ واہ مستری۔ واہ، خوب تم نے ہمدردی کی؟ خوب تم نے ہمسائے کا حق ادا کیا؟" اس کی آواز اور بھرا گئی اور مستری کے جواب کا انتظار کیے بغیر غصے سے کانپتا ہوا اپنے گھر میں چلا گیا۔ مستری ہکا بکا کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

گھر میں جا کر ماسٹر فرزند علی نے دیکھا کہ بیوی اسی طرح دالان کے کونے میں سر جھکائے مضمحل بیٹھی تھی۔ وہ بے چینی سے کمرے کے اندر جا کر دیوانے کتے کی طرح ادھر اُدھر تیزی سے گھومتا رہا۔ پھر دالان میں آ گیا اور بیوی کو مخاطب کر کے کہنے لگا: "میں نے کہا سن رہی ہو شبّن کی اماں! آیندہ اُس مستری کے بچے کے دروازے پر تم نے قدم رکھا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ خبردار جو اب تم اُس کے گھر گئیں۔ سالا کمینہ بھوکا کہیں کا۔"

وہ پیچ و تاب کھاتا ہوا پھر کمرے کی طرف چل دیا۔ بیوی نے ٹوک کر کہا: "وہ کیوں؟ آخر ہوا کیا؟"

وہ رک کر کہنے لگا: "کچھ نہیں کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ سالا ابھی مجھ سے ملا تو کہنے لگا تم اپنی بیوی کو میرے ہاں کھانا پکانے پر رکھ دو۔ حد ہو گئی حرام زدگی کی۔"

وہ بگڑ کر بولی: "سور کا بچہ، اُس کی ہمت کیسے ہو گئی؟ ابھی اباجان سنیں تو یہی کہیں کہ پاکستان جا کر تم دونوں نے خاندان کا خوب نام روشن کیا۔ پیشکار صاحب کی بیٹی اب مستریوں کی خادمہ بنے گی؟ ان ذلیلوں کی ٹہل چاکری کرے گی؟ خدا اس گھڑی کو موت نہ دے دے۔" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر اپنی قسمت کو رونے لگی۔ فرزند علی بھی اداس سا کمرے میں جا کر خاموش بیٹھ گیا۔ گھر پر ایک سناٹا چھا گیا۔ دھوپ دیوار سے پھسل کر اب دالان تک آ گئی تھی۔ اس میں گرمی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ فرزند علی بے حد اداس بیٹھا تھا۔ باہر دالان سے ابھی تک اس کی بیوی کی دبی دبی سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ فضا اتنی بوجھل اور بے کیف تھی کہ دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک گھر کا دروازہ شور کرتا ہوا تیزی سے کھل گیا۔

اس کے تینوں بچے صحن میں آ کر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ چیخ چیخ کر شور مچا رہے تھے۔ گھر کا سناٹا شکست ہو چکا تھا اور زندگی کے ہنگامے اداس فضا سے نکل کر بیدار ہو گئے تھے۔ جب بچوں کا شور زیادہ بڑھ گیا تو وہ کمرے سے نکل کر دروازے پر آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ دونوں لڑکے چھوٹی بچی کے ہاتھ سے کچھ چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔ بچی جھکی ہوئی زمین پر اوندھی پڑی تھی۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ سینے سے چپٹا لیا تھا اور دوسرے ہاتھ سے دونوں بھائیوں کو نوچ کھسوٹ رہی تھی، جو بری طرح اس سے چمٹے ہوئے تھے۔ اب اس کی بیوی بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ اس نے ڈانٹ کر انھیں علیحدہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ باز نہ آئے۔ آخر وہ ان کے نزدیک چلی گئی۔ اس نے دونوں کو زبردستی پکڑ کر الگ ہٹایا۔ بچی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے کپڑوں پر، بالوں پر، ہاتھ پیروں پر مٹی بھر گئی تھی۔ اس نے اب رونا بند کر دیا تھا۔ پھر اس نے خوشی سے ہنس کر اپنا ہاتھ نکالا اور بھائیوں کی طرف بڑھا کر کہا: "لو یہ رہی۔" اور اس نے اپنا ہاتھ کھول دیا مگر اس کا ہاتھ خالی تھا۔ لمحے بھر تک تو وہ اپنی ہتھیلی کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتی رہی پھر منہ بسور کر رونے لگی اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر وہیں مٹی میں لوٹ گئی۔ دونوں لڑکے خوشی سے تالیاں بجا کر ناچنے لگے: "اچھا ہوا، لے چلی گئی نا، اب تو ہم یہ بھی نہیں دیں گے۔" انھوں نے اپنی جیب کے اندر سے خوبصورت کاغذوں میں لپٹی ہوئی چاکلیٹ نکالی اور ماں کے پاس سے فوراً بھاگ گئے۔ ماں پوچھنے لگی: "ارے کم بختو! یہ تو بتاؤ اس کے ہاتھ میں تھا کیا؟"

ایک بچہ کہنے لگا: "چونّی تھی۔ صاحب نے ہم سب کو دی تھی۔ یہ اکیلی ہی اسے ہڑپ کر لینا چاہتی تھی۔ اب کھو گئی۔ اچھا ہوا۔"

ماں نے جلدی سے کہا: "تو وہ گئی کہاں؟" اور پھر بچوں کی بات نظرانداز کر کے بچی کے پاس پہنچ گئی اور نظریں گڑو کر ادھر اُدھر چونّی تلاش کرنے لگی۔ ذرا دیر بعد بچی کے پاؤں تلے سے مٹی میں دبی ہوئی چونّی نظر آ گئی۔ اس نے چپکے سے اسے اٹھا کر مٹھی میں دبا لیا اور بچی کو اٹھا کر چمکارنے لگی جو مٹی میں تھڑی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔ وہ دروازے سے لگا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر خاموشی سے کمرے کے اندر چلا گیا۔

اب دوپہر ہو گئی تھی۔ کل دن بھر کی بھوک جو رات کے

مسب مہنگ

ہنگامے سے بجھ گئی تھی، پھر سلگنے لگی تھی۔ فرزند علی چپ چاپ بیٹھا سوچتا رہا کہ اب وہ کہاں جائے، کیا کرے؟ باہر دالان میں بچّوں کے چلاّنے اور اس کی بیوی کے کوسنوں کی آوازیں سنائی پڑ رہی تھیں اور وہ ان آوازوں سے بے نیاز، صرف ایک ہی آواز سُن رہا تھا۔ بھُوک، بھُوک، بھُوک جو گھڑی کے پنڈولم کی طرح کھٹاک، کھٹاک، کھٹاک، ہر ہر پل اور ہر ہر سیکنڈ کے ساتھ ابھر رہی تھی۔

اسی لمحے اس کی بیوی کمرے کے اندر آگئی "لیجیے، یہ ذرا سے کچالو کھا کر پانی پی لیجیے، کچھ سہارا ہو جائے گا۔"

اس نے گھوم کر دیکھا، بیوی کے ہاتھ میں رکابی تھی جس میں اُبلے ہوئے آلوؤں کے تھوڑے سے قتلے تھے، جن پر نمک مرچ چھڑکا ہوا تھا۔ اس نے بیوی سے نظریں ملائے بغیر چپ چاپ رکابی ہاتھ میں لے لی۔ بیوی باہر چلی گئی۔ اس نے آلو کا ایک قتلہ اٹھا کر منہ میں ڈال لیا لیکن ابھی اس نے چند ہی قتلے کھائے تھے کہ باہر آنگن میں اس کے خالہ زاد بھائی کی آواز سنائی دی۔ اس نے رکابی اٹھا کر دیوار کے پاس ایک کونے میں چھپا دی اور جلدی جلدی منہ پونچھنے لگا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ اندر آگیا۔ فرزند علی دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ وہ بہت عرصے بعد آیا تھا۔ لہٰذا فرزند علی ہر ایک کے متعلق تفصیل سے پوچھ رہا تھا ——— آخر جب وہ اٹھ کر چلنے لگا تو فرزند علی نے اسے تکلفاً روکتے ہوئے کہا، "بیٹھو میاں، چائے تو پیتے جاؤ۔"

شاید اسے ابھی کچھ دیر اور باتیں کرنا تھیں اس لیے وہ ٹھہر گیا۔ فرزند علی نے اونچی آواز میں بیوی سے کہا "سن رہی ہو! تم نے سمیع کے لیے چائے تیار نہیں کی۔ کیا کہیں گے کہ بھائی کے ہاں گیا تھا۔ چائے تک کو نہ پوچھا۔" اس نے خواہ مخواہ خوش مزاج بننے کی کوشش کی۔ اسی وقت دروازے کی آڑ سے اس کی بیوی کا چہرہ نظر آیا۔ وہ ناراضی سے اس کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے گردن موڑ لی اور پھر باتوں میں مصروف ہو گیا۔ آخر جب وہ پھر اٹھنے کا ارادہ کرنے لگا تو فرزند علی نے اسے روک کر کہا "چائے تو پیتے جاؤ۔ نہ معلوم اتنی دیر کیوں ہو گئی ہے" اور خود اٹھ کر باہر دالان میں آگیا۔ بیوی کے قریب جا کر اس نے کہا "چائے کا تو بندوبست کر دو۔ سمیع کو تو تم جانتی ہی ہو، خالہ سے جا کر کہے گا۔ صاحب فرزند علی بھائی کے ہاں گیا تھا ایک پیالی چائے تک کو نہیں پوچھا۔"

اگست ۱۹۷۳ء

بیوی جل کر بولی "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ بچی کی چونی لے کر تو آلو منگائے تھے۔ میرے پاس آپ نے کچھ جمع کرا دیا ہے کہ چائے کا انتظام کر دوں؟"

فرزند علی بھی خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر ذرا جھجکتے ہوئے بولا "مستری کے ہاں سے لے آؤ۔"

وہ حیرت سے بولی "مستری کے ہاں سے؟ آج ہی تو آپ نے منع کیا تھا۔ میں تو اس کے ہاں اب تھوکنے کی بھی نہیں۔"

وہ اسے منانے لگا "سنو تو کہتا ہم جلد ہی تمھارا سارا قرضہ ادا کر دیں گے اور اس میں کچھ جھوٹ بھی نہیں۔ مسلم اسکول کے سیکرٹری نے آج مجھے بلایا بھی ہے۔"

مگر وہ آمادہ نہ ہوئی "وہ تو روز بلاتا ہے۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔" پھر اس نے خوشامد کے سے انداز میں کہا۔ "خدا کے لیے مجھے وہاں نہ بھیجیے۔ مجھے بڑی شرم معلوم ہوتی ہے پھر آج تو آپ سے اس کا جھگڑا بھی ہو گیا ہے۔"

فرزند علی خاموش ہو کر انگلی سے اپنے بال کریدنے لگا۔ اتنے میں سمیع نکل کر باہر دالان میں آگیا کہنے لگا "نہیں بھائی صاحب! آپ چائے کا تکلف نہ کیجیے، خواہ مخواہ بھابی کو تکلیف ہو گی" اور وہ روٹھا ہوا سا گھر سے باہر چلا گیا۔ فرزند علی نے اسے روکا بھی، مگر وہ واپس نہ لوٹا۔ اس نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

فرزند علی جب پھر کمرے میں گیا تو اس نے دیکھا کہ رکابی خالی پڑی تھی۔ اس کی غیر حاضری میں بچّوں نے اسے صاف کر دیا تھا۔ غصّے سے اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ بچّوں کو اس کا پہلے ہی علم تھا، اس لیے وہ گھر سے غائب ہو چکے تھے۔ اس نے جھنجلاہٹ میں رکابی اٹھا کر باہر آنگن میں پھینک دی اور اپنا ٹرنک کھول کر تمام کپڑے اُلٹ پلٹ کر رکھ دیے۔ پھر اس نے سرج کی شیروانی نکالی۔ اسے پہنا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔ بیوی نے اسے باہر جاتے ہوئے دیکھا، مگر شیروانی دیکھ کر اسے تعجب ضرور ہوا۔ اس لیے کہ فرزند علی یہ شیروانی خاص موقعوں پر پہنا کرتا تھا اور اسے بڑی حفاظت کے ساتھ رکھتا تھا۔ جب کبھی وہ اسے پہنتا تو بیوی کے سامنے اس طرح اترا اترا کر چلتا کہ اس کا ہر انداز چیخ چیخ کر کہتا۔ دیکھو کیسا جچ رہا ہوں کیا ٹھاٹ ہیں اپنے! اسکول کی کسی تقریب سے لوٹ کر آیا، تو بار بار اسے ہنسی آ رہی تھی بیوی نے پوچھا تو کہنے لگا "آج تو بڑا عجیب واقعہ پیش آیا۔ اسکول کے جلسے میں جو بھی آتا، وہ مجھے ہیڈ ماسٹر سمجھتا، پہلے مجھی سے

بڑھ کر مصافحہ کرتا۔ ہیڈ ماسٹر جل بھن کر رہ گیا۔" وہ جانتی تھی کہ یہ سب کچھ شیروانی کی شان میں قصیدہ خوانی ہو رہی ہے۔ مگر آج یہ شیروانی کیوں نکالی گئی ہے؟ پھر اسے خود ہی خیال آگیا کہ مسلم اسکول کے سیکرٹری سے ملنے گئے ہوں گے۔ اور اس احساس نے اسے اُمید اور ناامیدی کے دوراہے پر لا کر چھوڑ دیا۔

فرزند علی گھر سے نکل کر پرانے کپڑے فروخت کرنے والوں کی دکان پر پہنچا۔ آنے کو تو وہ اس بازار میں آگیا مگر کسی دکان میں داخل ہونے کی اسے ہمت نہ ہوتی۔ آخر وہ ایک دکان پر، جہاں بالکل سناٹا تھا۔ اللہ کا نام لے کر اندر چلا گیا۔ دکان میں الماریوں کے اندر، ہینگروں پر، دیواروں پر، ہر جگہ انگریزی وضع کے لباس ٹنگے تھے بعض تو ایسے اعلا درجے کے سلے ہوتے تھے کہ اسے اپنی شیروانی بے حد گھٹیا معلوم ہونے لگی۔ دکان دار اٹھ کر اس کے پاس آیا۔ "کیا چاہیے؟" پھر اس نے خود ہی کہا "کوٹ دکھاؤں یا کوئی سوٹ؟ ہمارے ہاں جو نیا مال آیا ہے، اس میں تو ایسے ایسے کوٹ ہیں کہ نیا اس کے سامنے شرما جائے۔ خاص امریکہ کے تیار کیے ہوئے کپڑے ہیں۔"

فرزند علی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "آپ کے ہاں شیروانیاں نہیں ہوتیں؟"

دکان دار مسکرانے لگا۔ "نہیں صاحب شیروانیاں کیسے ہو سکتی ہیں؟ یہ سب کپڑے تو امریکہ سے آئے ہیں۔"

فرزند علی کہنے لگا۔ "شیروانی اور اسی قسم کے کپڑے آپ اپنے ہاں سے خرید لیا کیجیے۔"

دکان دار اونچی آواز میں بولا۔ "ارے صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ امریکہ میں تو ہر سیزن میں کپڑے آؤٹ آف ڈیٹ ہو جاتے ہیں۔ وہاں ہر سال فیشن بدلتا ہے۔ نئے کے نئے کپڑے ایک دم کنڈم کر دیے جاتے ہیں۔ یہاں تو لوگ دس دس سال ایک کپڑا رگڑتے ہیں۔ اب یہ اپنی شیروانی دیکھیے۔ سات آٹھ سال سے کم کی کیا بنی ہوگی۔ ایسے کپڑے لے کر دکان پر لگائے جائیں تو آپ ہی بتائیے کون ان کو خریدنے آئے گا؟"

فرزند علی جل بھن کر رہ گیا۔ اپنی شیروانی کی وہ اس قدر ہتک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی اثنا میں دکان کے اندر ایک گاہک آگیا۔ دکان دار اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لہٰذا فرزند علی پیچ و تاب کھاتا ہوا دکان سے باہر آگیا۔ کسی اور دکان پر جانے کی اسے ہمت نہ پڑی۔ شام کو جب واپس لوٹا تو گھر میں اندھیرا پڑا تھا، بچے چیخ پکار کر رہے تھے۔ بیوی حسب معمول انھیں کوسنے دے رہی تھی۔ وہ چپ چاپ جا کر پلنگ پر بیٹھ گیا آخر تھوڑی دیر بعد بیوی نے آکر پوچھا۔ "سیکرٹری صاحب سے کچھ بات ہوئی ہے؟"

وہ اسے مایوس نہ کر سکا۔ "پرسوں پھر بلایا ہے۔"

وہ بولی۔ "تو کچھ اُمید ہے؟"

"ہاں۔ ہاں، کیوں نہیں۔" اس نے جھوٹ موٹ کی اُمید بندھوا دی۔

اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ اس نے شیروانی اتار کر کھونٹی پر لٹکا دی اور مضمحل سا بستر پر لیٹ گیا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی بچے روتے روتے سو گئے تھے۔ اندھیرا اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔ آخر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر تک بے چینی سے دالان میں ٹہلتا رہا۔ گھر پر موت کی سی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کمرے میں آکر شیروانی پہنی۔ بڑے لڑکے کو اٹھایا۔ وہ ابھی سویا نہیں تھا۔ کیروسن آئل کی بوتل اسے دی اور اپنے ساتھ لے کر باہر چلا گیا۔ بیوی نے خاموشی سے سب کچھ دیکھا مگر وہ کچھ بولی نہیں، چپ چاپ لیٹی رہی۔

باہر آکر وہ سیدھا محلے کے پرچونیے کی دکان کی طرف چل دیا۔ سردی کی وجہ سے سرِ شام ہی سناٹا پڑ گیا تھا۔ دکان پر اس وقت سوائے دکان دار کے کوئی اور موجود نہ تھا۔ فرزند علی کہنے لگا۔

"خاں صاحب! تم نے ابھی تک دکان نہیں بڑھائی؟"

وہ کہنے لگا۔ "بس بند کرنے ہی جا رہا تھا۔ آج سردی بھی کچھ زیادہ ہے۔"

فرزند علی نے کہا۔ "ہاں آج سردی زیادہ ہے۔ تمھارا کیا ہے بھائی، تم تو سنا ہے کہ آج کل بادام کا نشاستہ پیتے ہو۔" وہ خواہ مخواہ اس سے بے تکلفی برتنے لگا۔

"صحت بھی ماشاءاللہ ادھر اچھی ہو گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے خاں صاحب تم پر تو پھر سے جوانی آگئی ہے۔" فرزند علی یہ کہہ کر ہنسنے لگا۔

دکان دار بھی مسکرا دیا۔ "ماسٹر جی کیوں ایسی باتیں کرتے ہو۔ غریب آدمی ہوں۔ بال بچوں کا پیٹ پال لیتا ہوں۔"

فرزند علی جھٹ سے بولا۔ "ہاں بھئی تمھاری ہمت پر آفریں ہے۔ اکیلے دم پر اتنا بڑا ٹبر سنبھالے ہوئے ہو۔" پھر اس نے فوراً

ہی بات کا رُخ بدل کر کہا۔" ذرا ایک بوتل مٹی کا تیل تو دینا۔" اور لڑکے سے بوتل لے کر اس کی طرف بڑھا دی۔ دکان دار نے بوتل میں تیل بھر دیا۔

فرزند علی نے بوتل لڑکے کو دے کر کہا۔" اچھا تم چلو۔ امی سے کہنا میں ابھی آتا ہوں۔" لڑکا گھر کی طرف چل دیا۔ وہ دکان دار سے کہنے لگا۔" اس کے پیسے کل آجائیں گے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ۔"

دکان دار نے فوراً اسے ٹوک دیا۔" ماسٹر جی اس طرح کام نہیں چلے گا۔"

وہ زبردستی ہنسنے لگا۔" اماں اس طرح بھی کام چلتا ہے۔" اس نے پھر بات بدلنے کی کوشش کی۔" ہاں تو۔"

دکان دار نے پھر اس کو ٹوکا۔" نہیں جی! قرض میں نے بالکل بند کر دیا ہے لڑکے کو بلا لیجیے۔" اس نے فرزند علی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ لڑکے کو آواز دے کر واپس بلا لیا۔ اس سے بوتل لی اور کنستر میں تیل انڈیل کر خالی بوتل اسے تھما دی۔ بچہ سہما ہوا سا باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ فرزند علی جھینپ مٹانے لگا۔" وہ خاں صاحب! بعض وقت تو تم ایسی بے مروتی پر اتر آتے ہو کہ بالکل مارواڑی معلوم ہونے لگتے ہو۔ اماں تمھارے سے پیسے لے کر یہاں سے بھاگنے سے تو رہا۔"

مگر خاں صاحب نے کوئی جواب نہ دیا اور اٹھ کر دکان بند کرنے کے واسطے قفل نکالنے لگا۔ فرزند علی ذرا دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر دکان سے ہٹ آیا، لڑکے کو اس نے گھر بھیج دیا اور خود دودھ والے کی دکان کی طرف چل دیا۔ اس لیے کہ گھر کے اندھیرے سے اسے وحشت ہو رہی تھی۔

دودھ والے کی دکان پر ایک دھندلی سی لالٹین جل رہی تھی اور کئی آدمی بیٹھے دودھ پی رہے تھے۔ فرزند علی بھی وہاں پہنچ گیا۔" کہو بھئی پہلوان کیا حال ہے؟"

وہ کہنے لگا۔" ماسٹر صاحب سب خدا کا شکر ہے۔"

" ہاں میاں، بہر حال ہیں اس کا شکر ادا کرنا چاہیے وہ بڑی شان والا ہے۔"

دودھ والا اپنی بات کہہ کر فوراً کام میں مصروف ہو گیا۔ فرزند علی وہیں بنچ پر بیٹھ گیا جو لوگ وہاں بیٹھے تھے کچھ دیر بعد اٹھ کر چل دیے اب دکان پر سناٹا ہو گیا تھا۔ پہلوان کے علاوہ دکان میں سامنے پلنگ پر ایک شخص رضائی اوڑھے پڑا سو رہا تھا۔ ذرا دیر تک

خاموشی چھائی رہی۔ پھر دکان دار کہنے لگا۔" ماسٹر صاحب، اب کسی چیز میں برکت نہیں رہی۔"

وہ بولا۔" ہاں بھئی، برکت رہے بھی تو کیسے؟ لوگوں کی اب وہ نیتیں نہیں رہیں۔ وہ ایمان نہیں رہے۔"

دکان دار کہنے لگا۔" بالکل ٹھیک کہا آپ نے یہی حال ہو رہا ہے۔" پھر وہ دکان داری کے خراب ہونے کا رونا رونے لگا۔" اب کیا بتاؤں آپ سے کہ کس طرح دکان داری چلتی ہے لوگوں کو کھانے کو تو میسر نہیں۔ بے چارے دودھ کہاں سے پئیں۔"

فرزند علی نے باتوں میں دل چسپی لینا شروع کر دی۔" عجیب زمانہ آیا ہے۔ ایسا تو کبھی دیکھا اور نہ خدا دکھائے۔ ایک یہ وقت ہے، ایک زمانہ تھا، خدا بخشے والد مرحوم زندہ تھے گھر پر بھینسیں بندھی رہتی تھیں۔ گابھن ہوئی تو گاؤں بھجوا دی۔ دوسری بیوائی دونوں وقت میں ۲۵ سیر تک دودھ دیا ہے ہماری بھینسوں نے۔ ابا جان زبردستی سر پر سوار ہو کر دودھ پلواتے تھے، جہاں ان کی نظر بچی اور میں نے جھٹ سے کٹورا اوندھا کر دیا۔ اماں تم کو تعجب ہو گا۔ ہمارے آنگن کا فرش کچا تھا۔ جہاں میں دودھ پی لیتا تھا وہاں کی زمین ایسی چکنی ہو گئی تھی کہ نچوڑ دو تو چکنائی ٹپک پڑے۔"

پہلوان کہنے لگا۔" کیوں نہیں ماسٹر صاحب، کیوں نہیں اُس دودھ کی کیا بات تھی۔"

فرزند علی جیسے اسے مرعوب ہی کرنے پر تلا ہوا تھا کہنے

معمار اپنا کام ختم کر کے بالائی منزل سے نیچے اُترنے ہی والا تھا کہ پیر پھسلا اور وہ نیچے سڑک پر ایک راہ گیر کے اوپر جا گرا۔ خود تو بچ گیا، لیکن راہ گیر مر گیا۔ مرنے والے کے ورثا نے معمار کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ قاضی صاحب نے اس عجیب مقدمے کا فیصلہ سنا دیا۔" مرنے والے کے ورثا کو خوں بہا دیا جائے۔"

لیکن ورثا نے اس فیصلے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا۔" ہم خوں بہا نہیں قصاص چاہتے ہیں!"

قاضی نے بدرجۂ مجبوری اپنا دوسرا فیصلہ سنا دیا۔" مرنے والے کے ورثا میں سے کوئی بالائی منزل پر جائے اور وہاں سے نیچے کھڑے ہوئے معمار پر کود پڑے۔"

ورثا نے ڈر کر قاضی کے پہلے فیصلے کو قبول کر لیا۔

لگا۔"سستا زمانہ تھا۔ دو روپے میں نوکر مل جاتا تھا۔ گھر میں خدا جھوٹ نہ بلائے تو کوئی درجن بھر ملازم ہوں گے۔ پوری پلٹن تھی۔ اس خیال سے کہ ابا جان ہمیں دودھ نہ پلا دیں، چپکے چپکے انھیں گلاس بھر بھر کر پلا دیتے تھے۔ سالے پھول پھول کر مکھنا ہاتھی ہو گئے تھے۔"

پہلوان نے بات کا جواب نہیں دیا۔ اس لیے کہ دودھ نکالنے کی ڈونگی اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر گئی تھی۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے دوسری طرف جھک گیا۔ فرزند علی کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔ اچانک اس کی نظر لکڑی کے اس ڈبے پر پڑ گئی جو کھلا ہوا تھا۔ اس میں کچھ ریزگاری، چند روپے اور ایک دس والا نوٹ پڑا تھا۔ فرزند علی نے لمحے بھر تک اس طرف دیکھا اور پھر بلی کی طرح چوکنا نظروں سے چاروں طرف دیکھ کر اس نے نوٹ اٹھا لیا۔ اسی وقت دودھ والا پہلوان دودھ کی ڈونگی اٹھا کر اپنی جگہ آ گیا۔ فرزند علی نے گھبرا کر نوٹ شیروانی کی نچلی جیب میں ڈال لیا۔

دودھ والے نے اس کے چہرے کا رنگ متغیر دیکھا تو کہنے لگا "کیوں ماسٹر صاحب، کیا ہو گیا؟"

فرزند علی کہنے لگا "کچھ نہیں بھئی، بیٹھے بیٹھے پیٹ میں مروڑ سی معلوم ہوئی۔ خدا خیر کرے۔" ذرا دیر وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر چلنے لگا۔ پہلوان کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ وہ گلّے سے روپے نکال کر گننے لگا۔ پھر خود ہی بولا "یہ دس کا نوٹ کیا ہو گیا؟"

فرزند علی اور گھبرا گیا۔ اس نے سوچا۔ اب یہاں سے کھسک جانا ہی بہتر ہوگا۔ اس نے اپنا خالی پیٹ خواہ مخواہ زور سے دبوچ لیا "دو بھئی بڑی تکلیف ہو رہی ہے، میں تو چلا۔"

دودھ والے نے جیسے سنا ہی نہیں۔ نوٹ کے غائب ہو جانے سے وہ بے حد پریشان ہو رہا تھا۔ اتنے میں پلنگ پر لیٹا ہوا آدمی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ پوچھنے لگا "چاچا کیا ڈھونڈ رہے ہو؟"

وہ کہنے لگا "ایک دس کا نوٹ جانے کہاں چلا گیا۔"

اس کا بھتیجا بھی اٹھ کر وہاں آ گیا۔ فرزند علی اب دکان سے آگے بڑھ چکا تھا۔ وہ بے حد گھبرایا ہوا تھا۔ ابھی چند قدم ہی وہ چلا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کا کندھا پکڑ کر کہا "ذرا ادھر آنا جی ——"

فرزند علی نے گھوم کر دیکھا۔ پہلوان کا بھتیجا اسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ بولا۔ "چاچا نوٹ یہ رہا۔"

اس نے فرزند علی کی جیب سے دس کا نوٹ نکال کر سامنے کر دیا۔ وہ ہوا یہ کہ گھبراہٹ میں اس نے نوٹ اس طرح رکھا تھا کہ جیب میں سے اس کا ایک سرا دکھائی دے رہا تھا۔ دکان دار کو فرزند علی پر ایک دم غصہ آ گیا۔ وہ آپے سے باہر ہو کر دکان سے نیچے کود پڑا اور جاتے ہی اس نے فرزند علی کی کمر پر اس زور سے لات ماری کہ وہ منہ کے بل گر پڑا۔ مگر وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور پٹ پٹ چلانے لگا۔ اس کی آواز اس قدر بھرائی ہوئی تھی کہ منہ سے بول نہیں پھوٹ رہا تھا۔ لیکن پہلوان نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ اس نے لپک کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور گالیاں دینے لگا۔ فرزند علی کہنے لگا "اماں گریبان تو چھوڑ دو! دم گھٹا جا رہا ہے۔"

پہلوان نے اس کے منہ پر کس کے تھپڑ مارا اور چیخ کر بولا۔ "سالے شرم نہیں آتی چوری کرتے ہوئے۔"

فرزند علی نے اس کی بات نظرانداز کر کے کہا "اچھا میرا گریبان تو چھوڑ دو۔ شیروانی کا کالر خراب ہو جائے گا۔"

دودھ والے نے اس زور کا جھٹکا دیا کہ شیروانی کندھے سے پھٹ کر کمر تک آ گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے پھر لاتے مارنا شروع کر دیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا "سالے چور! مار مار کر تیرا بھرکس نکال دوں گا۔ تو اسی لیے اتنی رات کو دکان پر آیا تھا۔"

فرزند علی آہستہ آہستہ بول رہا تھا "تم اتنا شور کیوں مچا رہے ہو؟ تمھارا نوٹ مل گیا۔ اب مجھے چھوڑ دو۔ تم نے اتنا مار بھی دیا اب اور کیا چاہتے ہو؟"

مگر پہلوان ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ کہنے لگا "میں تجھ کو تھانے لے جاؤں گا۔ سالے تجھ کو یوں نہیں چھوڑوں گا۔"

شور سن کر پاس پڑوس کے بہت سے لوگ نکل کر وہاں اکٹھا ہو گئے۔ پہلوان نے اب اس کی قمیص کا گریبان پکڑ لیا تھا۔ فرزند علی بار بار کہہ رہا تھا کہ "میری بات تو سنو۔"

اتنے میں ایک شخص آ گیا۔ جو کسی سرکاری محکمے میں ملازم تھا۔ اسے فرزند علی کی حالت پر ترس آ گیا۔ اس نے پہلوان سے ڈانٹ کر کہا "گریبان تو چھوڑ۔"

پہلوان نے گریبان چھوڑ دیا۔ وہ آدمی فرزند علی سے کہنے لگا "پہلے آپ بتائیے کہ بات کیا تھی؟"

فرزند علی کہنے لگا "صاحب میں شریف آدمی ہوں۔ یہ بدمعاش لوگ ہیں۔ خواہ مخواہ مجھ پر چوری کا الزام لگا رہے ہیں۔ دیکھیے میری اتنی اعلیٰ شیروانی بھی پھاڑ ڈالی اور برابر مار پیٹ رہے ہیں۔" وہ

مسکین بنا ہوا جھوٹ موٹ کی صفائی پیش کرنے لگا "خدا کی قسم میں نے اس کا نوٹ دیکھا تک نہیں۔"

پہلوان کا بھتیجا ایک دم چیخ کر بولا "او سور کے بچے جھوٹے ابھی تو تیری جیب سے نوٹ نکالا ہے۔"

اس کے جھوٹ بولنے پر پہلوان کو پھر غصہ آ گیا۔ وہ اسے موٹی موٹی گالیاں دینے لگا۔ اس نے پھر جھپٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور فرزند علی کے حمایتی کی طرف آنکھیں نکال کر بولا "دیکھیے بابو جی! آپ اس معاملے میں نہ بولیے ورنہ بات بڑھ جائے گی۔"

بے چارے بابو جی پہلوان کی خوں خوار آنکھوں سے سہم کر رہ گئے۔ وہ بات آگے نہ بڑھا سکے اور مجمع سے کھسک کر پیچھے آ گئے۔ پہلوان کو اس بات کی ضد تھی کہ وہ فرزند علی کو تھانے لے جائے بغیر باز نہیں آئے گا۔ اتنے میں کسی نے ہجوم میں سے چیخ کر کہا "پہلوان تھانے لے جا کر کیا کرو گے۔ دس بیس جوتے مار کر چھوڑ دو۔ سالا بال بچے والا ہے۔ یہ تو جیل چلا جائے گا۔ وہ بے چارے بھوکے مر جائیں گے۔"

پہلوان یہ تجویز قبول کرنے میں ہچکچا رہا تھا۔ اتنے میں اسی آدمی نے جس نے یہ مشورہ دیا تھا، جوتا اتارا اور دھڑا دھڑ جوتے مارنا شروع کر دیے۔

فرزند علی چیختا رہا۔ "میری بات تو سنو۔ میں شریف آدمی ہوں۔" مگر وہاں کون اس کی سنتا تھا۔ وہ قسمیں کھاتا رہا۔ اپنی بے گناہی ثابت کرتا رہا۔ مگر جوتے دھڑا دھڑ پڑتے رہے۔ پھر اس آدمی نے ہانپنے کے سے انداز میں ہاتھ روک کر کہا "اچھا اب اسے جانے دو۔" اور وہ فرزند علی کا ہاتھ پکڑ کر لوگوں کی بھیڑ میں سے باہر نکال لایا اور سرگوشی کے سے انداز میں بولا "کہو استاد کیسا صاف بچا دیا۔ ورنہ ابھی حوالات میں ہوتے۔ تم شریف آدمی ہو۔ اسی کو غنیمت جانو۔"

فرزند علی کو اس پر بے حد غصہ آیا مگر وہ کرتا بھی کیا۔ چپ چاپ شریف آدمی کی طرح اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ گھر میں جا کر اس نے دیکھا کہ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور بیوی جاگ رہی تھی اس کی پھٹی ہوئی شیروانی اور بگڑا ہوا حلیہ دیکھ کر بولی "یہ کیا ہو گیا؟ کسی سے لڑ کر آئے ہو؟ شور تو میں نے بھی سنا تھا"

وہ خشم گیں نظروں سے گھور کر بولا "کچھ نہیں ہوا۔"

وہ اصرار کرنے لگی "کچھ تو بتاؤ کہ ہوا کیا؟"

وہ بگڑ کر بولا "یہ روشنی کمرے میں کیسی ہو رہی ہے؟ تم پھر اس خبیث مستری کے ہاں گئی تھیں؟ میں نے ہزار دفعہ سمجھا دیا کہ وہاں نہ جایا کرو۔ مگر تم ذات کی ڈومنی ہو ڈومنی۔ کمین خصلت کہیں جا سکتی ہے۔" وہ اس پر برس پڑا۔

وہ خوشامد کے سے انداز میں بولی "اس کے ہاں کب گئی تھی۔ آپ کے جانے کے بعد یہ بچے سب جاگ اٹھے تھے انھیں بہلانے کے لیے کلب کی طرف لے گئی تھی۔ وہاں آج کوئی بڑا جشن تھا۔ بڑی بھاری دعوت تھی۔ خوب روشنی ہو رہی تھی۔ بینڈ بج رہا تھا عورتیں اور مرد مل کر ناچ رہے تھے۔" وہ بچوں کی طرح ایک ایک بات تفصیل سے مزا لے لے کر بتا رہی تھی "وہیں کوڑے کے بڑے ٹین میں سے یہ بچے نہ جانے کیسے ایک موم بتی ڈھونڈ لائے۔ وہی میں نے جلا دی۔"

فرزند علی خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا اور فرش پر پڑا ہوا ایک توس کا ٹکڑا دیکھ کر بولا "اور وہیں کوڑے گھر سے، لوگوں کا بچا کھچا کھانا بھی اٹھا لائیں؟ میں کہتا ہوں، تم کیوں میری عزت کے پیچھے پڑی ہو۔ دنیا میں ایسی بھی عورتیں ہیں۔ جن پر سات سات وقت کا فاقہ پڑتا ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ اور ایک تم ہو: بیوی کی... چوری پکڑ لی گئی تھی۔ وہ جھنجھلا کر بولی "تو آخر میں کیا کروں؟ ان حرام زادوں نے میری بوٹیاں نوچنی شروع کر دی تھیں۔" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر زور زور سے رونے لگی۔

فرزند علی کو اس کا اس طرح رونا بہت برا لگا۔ اس نے غصے میں اس کے بال پکڑ کر اس زور سے کھینچے کہ وہ فرش پر منہ کے بل گر پڑی۔ فرزند علی اس وقت واقعی دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس نے اس کی کمر پر اور پیٹھ پر جوتوں کی ٹھوکریں مارنا شروع کر دیں۔ شور سن کر بچے بھی جاگ اٹھے۔ اور چیخ چیخ کر رونے لگے۔ فرزند علی نے چیخ کر کہا۔ "چپ ہو جاؤ، سور کے بچو۔"

وہ سور کے بچے تو ڈانٹ سے خاموش ہو گئے۔ البتہ سور کی بچی اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ فرزند علی نے جھنجھلا کر اس کے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ وہ لڑھکتی ہوئی بستر کے دوسرے کنارے تک چلی گئی اور خوف زدہ ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ فرزند علی لمحے بھر تک گھورتا رہا۔ پھر جیسے اسے خود ہی اپنی حالت پر ترس آ گیا۔ وہ وحشیوں کی طرح پلٹا اور دیوار پر سر دے مارا۔ "اور لو اور لو۔ اور لو۔" وہ دیوانوں کی طرح دیوار پر ٹکریں مارتا رہا۔ پیشانی سے اس کا سر پھٹ گیا۔ اور خون بہتا ہوا اس کے چہرے پر پھیل گیا۔ دھندلی روشنی میں خون سے لتھڑا ہوا اس کا چہرہ بے حد خوف ناک نظر آ رہا تھا۔ بچے چیخ کر ایک دوسرے

سے چمٹ گئے۔ لیکن فرزند علی اس طرح زیادہ دیر تک کھڑا نہ رہ سکا۔ اس کے پیر کانپنے لگے تھے اور پھر وہ نڈھال ہو کر فرش پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

بہت دیر بعد اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ کمرے میں گھور اندھیرا تھا۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ اور اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ اس نے سر پر ہاتھ پھیرا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کی پیشانی پر پٹی بندھی ہے۔ وہ دیر تک اسی طرح پڑا رہا۔ اس کا ذہن ہر خیال سے خالی ہو چکا تھا اور پیٹ میں آگ سی لگ رہی تھی۔

وہ آہستہ سے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اندھیرے میں ہر طرف نظریں دوڑائیں۔ مگر اس کو سوائے اس کے کچھ اندازہ نہیں ہوا کہ سب سو رہے ہیں۔ وہ چپ چاپ باہر چلا گیا۔

کلب میں سناٹا ہو چکا تھا۔ روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ دیوار کے سائے میں کچھ کتے لڑ رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ کتے اسے دیکھ کر غرائے اور پھر وہاں سے بھاگ گئے۔

اس کے چاروں طرف کھانوں کی خوشبو ابھر رہی تھی۔ اس نے کئی بار تیز تیز سانس بھر کے نتھنوں میں ان کی خوشبو محسوس کی۔ ایک بار اس نے چاروں طرف چوروں کی طرح دیکھا اور پھر خود ہی مسکرا دیا۔ بھلا اس وقت اتنی رات گئے یہاں کون آنے لگا۔ اس نے جھک کر ردی کے کچھ بچے کھچے ٹکڑے اٹھائے اور انھیں جلدی جلدی کھانے لگا۔

اچانک اسے کوڑے کے بڑے ٹین کے پاس ایک انسانی سایہ نظر آیا۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اندھیرے میں ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ یہ اس کی بیوی کی آواز تھی۔ دونوں لمحے بھر چپ چاپ خاموش کھڑے رہے۔ پھر اس نے ایک ٹکڑا اس کی طرف بڑھا کر کہا "لو کھاؤ مزے دار ہے"۔ بیوی نے چپ چاپ ہاتھ بڑھا کر اسے لے لیا۔

